

لئے پر تول رہا تھا۔ کفیوں ز کرو، یہ سامراج کا پرانا ہٹکنڈا ہے۔ آج سب سامراجی ایجنت یعنی کمر رہنے ہیں۔ پھر دانت پکچا سے اور میر پر مکارا۔ «سامراجی ذلّوں تھارے ہٹکنڈے اب نہیں چلیں گے۔ تم ہندوستان سے کفیڈ لیش کردے اپنے آپ کو بچالے جانا چاہتے ہو، غربوں کی آواز کو بانا چاہتے ہو۔ ہٹکنڈے نہیں چلیں گے۔ ہندوستان کے ساتھ کفیڈ لیش نہیں ہو گا جنگ ہو گی۔» یہ سلامت نے اتنے اوپنے لمحے میں کہا کہ شیراز میں بیٹھے ہوتے سب لگ سن لیں۔ انہوں نے ستا اور اسے اور عرقان کو الیبی نظرؤں سے دیکھا جیسے وہ پاکستان کے خلاف کوئی بڑی سازش کرتے ہوتے پکڑ سکتے ہیں۔ سلامت نے اور گرد المینان پھری نظر ڈالی اور پھر شروع ہو گیا۔ «جنگ ہو گی اور تم جس فرسودہ نظام کے سوارے کھڑے ہو اس کے پرچے ال جایں گے۔ یہ جو تم اپنی سڑی بسی اخلاقی قدریں لئے پھر رہے ہو تو وہ معاف شری میں تعفن پھیلا رہے ہو، ان میں سے کوئی قدر باقی نہیں۔ پچھے کی۔ میرا یادو گو باپ مجھ سے پوچھنے لگا کہ پھر باقی کیا پچھے گا۔ میں نے کہا کہ بڑھے امیں باقی پیکوں گا دیں، «القلاب» افضل جانے کس وقت اکہ خاموشی سے پیٹھ گیا اور سلامت کو گھوڑے جارہا تھا جب تقریب تھم ہوتی تو اس نے زبان کھوئی۔ «جو ہے، تیرے خیالات سے انسان ہر میلان تعفن اُٹھتا ہے۔ کہاں شیراز کرنے کے لئے مجھے گیس اسک پہنچا پکڑے گا۔»

سلامت نے خنگیں نظرؤں سے افضل کو دیکھا۔ ایک دفعہ پھر میر پر مکارا اور چلایا «رجعت پسند و اسماراج کے پتوں و اسراییداروں کے بوٹ چلتے والوں تھارے حساب کا وقت آگیا ہے۔»

«کا کے ہوئے یوں۔ آدمی قوبیدی سا ہے اور حلن سے آواز اتنی اوپنی نکالتا ہے۔»

سلامت کو افضل کے انداز تھا طب نے لوکھلا دیا کہ یہ انداز تھا طب اس کی قائدانہ چیختیت پر ایک کاری ضرب تھا۔ شعلے برساتی نظرؤں سے اسے گھوڑتے ہوئے ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا «ذلّوں اخوات کے خلاف تھاری سازش نہیں چلے گی۔»

”نہیں چلے گی، نہیں چلے گی“ پوری ٹپٹن نے نفر سے لگانے شروع کر دیتے اور نفر سے
لگاتے لگاتے ٹپڑا سے نکل گئے۔

ٹپٹن کے نکلتے ہی خاموشی چھاگتی، تینوں کچھ دیرچپ بیٹھتے رہے۔ پھر افضل بڑھتا ایسا ”یار
بے افلابی تو، ہمیں پر باذکر دیں گے اور یہ چوہا کتنا بولتا ہے۔“
”یہ امنی لوگوں کے بولنے کا زمانہ ہے۔“ عرفان بولا۔

جب جو نکے تسمیہ بولیں گے اور کلام کرتے والے چب ہو جائیں گے۔ وہ چونک
پڑھا۔ کب کی بات اسے یاد آئی تھی۔ ان دونوں اس کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ ایسے ہی کوئی چھوڑا
پسرا مکالمہ کوئی ابا جان کا کہا ہو افقرہ کوئی جی اماں کی کہی ہوئی بات اچانک سے یاد ہجاتی اور
ترت ہی بسر جائی، جیسے سانپ گھاس میں سے سر نکالے اور قوراً ہی گھاس میں گم جاتے۔

”کا کے! ایسے زماں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ افضل بولا۔ ”حلو طاقتور ہو جاتے ہیں
اور ذہن مکروہ پڑھ جاتے ہیں جب اس نکرہ وہ آدمی کی آواز سنتا ہوں تو لگتا ہے کہ سکونت
میں بڑک کاہن گگا ہے جب اس کے سر پر نظر دالتا ہوں تو مجھے وہ شاہ دولہ کا چوہا نظر
آتا ہے۔ یہی نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس کے سر کو پھوکے دکھیلوں، مگر میری طبیعت گنجانا جاتی ہے۔
جیسے کوئی گلکلی چیز چھوٹی ہو۔ میں ہاتھ کچھ لیتا ہوں سارے کام بڑھتا ایسا ”چوہے“ اچب ہو گیا۔ پھر
سوچتے ہوئے فری سی آفانی میں بولا دریا! کجھی کبھی چلتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں الیلا آدمی
ہوں کہ چل رہے ہوں، باقی بخوبی پر دوڑ رہے ہیں اور آواز سی آتی ہے جیسے کوئی کچھ کتر رہا ہو۔“
چب بیٹھا رہا۔ گری سوچ میں ٹوپا ہوا پھر بولا ”یار واس کا کچھ کر وو۔“

”فضل، آج تم نے زیادہ پی لی ہے۔“

”کا کے! جو کہتا ہوں اسے حور سے سن۔“ افضل نے عرفان کی آنکھوں میں آنکھیں طال کر کرنا
پھر قریب سرک آیا اور دھمی رازدارانہ آوار میں بولا پاکستان لاک امانت ہے۔ تم دونوں یہی
بازو بن جاؤ۔ میں اس امانت کو سنبھالتا ہوں۔ نہیں تو یہ چوہے سب پاکستان کو کتر کر کے اس کا

بلادہ بنادیں گے۔»

سید سروال آدمی اپنی میر سے اٹھا، قریب آیا، بولا «افضال صاحب! آپ سچ کتھے ہیں پاکستان ایک امانت ہے۔»

افضال نے سید سروال کے کو گھوڑے دیکھا «سید سروال کے آدمی! تو اس وقت والپس چلا جا۔ میں اس وقت ان دو طبیب آدمیوں کو بہاریات پنجار ہے ہوں گے»
 «جیک ہے، جیک ہے!» سید سروال آدمی اپنی میر پر کیا اور اخبار پڑھنے میں صرف ہو گیا۔

افضال اٹھ کھڑا ہوا۔
 «کیوں؟ جار ہے ہو؟»

«ہاں یاں بانش غارت ہو گیا۔ اپنے جھے ایک جر عروپیتا پڑھے گا۔» رکا، پھر بڑھ دیا۔
 «پوچھے ہے! لگ رہا تھا کہ سب ابھی شراب کے نکلے میں ڈیکن کھا کر نکلے ہیں اور اپنی دموم، بر کھڑے ہیں۔» چیپ ہوا، کچھ سوچا، باہر تسلی گیا۔
 سید سروال نے اخبار سے سراٹھا بیا، دیکھا کہ افضل چلا گیا ہے، اٹھ کر آیا ویسے کیا خیال ہے آپ کا، جنک ہو گی؟»

«آپ کا کیا خیال ہے؟» عرفان نے جلنے پھنس لئے میں پوچھا۔

«میرا خیال! سوچ میں پڑ گیا! صاحب حالات بہت خراب ہیں۔»

«اچھے کہ تھے؟»

«یہ یعنی آپ سچ کتھے ہیں۔ حالات یہاں اچھے کہ ہوتے تھے۔»
 چپ ہوا، پھر بڑھ دیا۔ ہم برقہت لوگ ہیں۔، واپس اپنی جگہ جائیں گے پھر عبدال کو دار دی۔ بل ادا کیا افادہ چلا گیا۔

کہتا ہے میرے مرکے بال بھرت میں سفید ہونے ہیں۔» عرفان ہنسا۔

اس نے سخیدگی سے عرفان کو دیکھا۔ ایک بات تو ہے۔ ہم نے جب سے اسے دیکھا ہے تب سے یہ شخص ایسا ہی ہے۔»

« اور کتنی پاندی سے یہاں آتی ہے۔» عرفان پھر خفظہ اہنسا، وہ اس شخص کے بارے میں سخیدہ ہونے کے لئے تیار ہیں تھا۔

« شروع زمانے سے آ رہا ہے، اسی وضع داری کے ساتھ اور اسی زمانے میں اس کے سرکے سارے بال سفید تھے۔ ہم کامنہ تے تھے کہ اس کے سر پر برف گردی ہے۔، رکا، چپ، ہو گیا جیسے جنالوں میں ہو گیا ہو۔ پھر کہنے لگا ہمارا اس زمانے کے بعض لوگ تو بالکل ہی غائب ہو گئے یہ کتنے کھنڈے خود بھی غائب ہو گیا۔ کتنے بھوٹے بھرے پر ہر سے ایک دم سے قصور میں انہیں آتے تھے۔ کوئی کوئی ذہن لا کہ انھوں کے سامنے آیا اور سرک گیا۔ کوئی صاف اور روشن کہ انھوں کے سامنے آگئا ایسا تکمیل گیا جیسے اب نہیں سر کے لگا۔ بلاؤ ٹیا، محقر سادجی کہ مکملی میں آجائے، پھر ٹیڈاڑھی، ٹھنڈنا فر۔ بس جی مجھے تو گوالیاری پسیے نے بچایا۔»

« ملا، وہ کیسے؟»

« چلتے ہوتے بال اسیاب سب وہیں پہنچھوڑا۔ یہ بس ایک گوالیاری پسیے انٹی میں اڑاں لیا۔ سکھوں نے حملہ کیا تو میں نے کہا کہ ابے ملاں! آج تیرے ہم رکا امتحان ہے اور بیوٹ کی عزت تیرے لاخ تھے ہے گوالیاری پسیے انٹی میں سکھوں بیوال میں ہاندھ ایک دفعہ جو گھمایا تو بھموں کی کلاسیں اُتار دیں۔ بس جی پچھکے چھڑا دینے۔»

اور کہتا ہے، سو کھا چھرخ، لگے میں پالوں کا خواپنچہ سخت بالتوں درماں، میں بھی وہیں سے آیا ہوں۔ جہاں سے تمہارے لیاقت علی خاں آتے ہیں بس ایک آپنے کی کسرہ رکھتی کہنا یہوں ہیں یہی توصفت ہے۔ پورا ایک جا میتے تو فذیر اعظم، ایک آپنے کی کسرہ جاوے توجہتے بنادے کا بیان بیچے گا۔»

اور نوروز نابھائی، نحالت انبالوی ہونے کا مدعا سید صاحب! ان میں سے کوئی

انبا لے والا نہیں ہے سب سلے ماقصورے کے بین، ذات کے شیخ۔ انبا لے کا پنچالہ مول
کے ساتھ لگایا ہے۔ انبا لے کا واکیلا میں ہوں جب ہی تو وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملا تے۔
بس جی پاکستان میں تو اسیا ہی ہے۔ وہ سالا مبو بخوبی کہ سی کار ہستے والا اپنے کو نکھلتو کاواب
بناتا ہے۔“

شہروں سے نکلے ہوتے شہروں کی امانتیں سروں پر اٹھاتے ہوتے یہی ہوتا ہے شہر چھٹ
کہ بھی نہیں چھٹتے۔ پھر تو جڑ پکڑ لیتے ہیں، زین اس وقت گھیرا ذلتی ہے۔ جب قدموں تسلی سے
سرک جاتی ہے اور بے شک مٹی کی گکٹ سخت ہوتی ہے، مگر مولوی دیا سلا قی ہو وہ کماں کا ہے
والا تھا؟ تھا کسی سے بولنا زیادت کرنا، اپنے آپ میں گم اور ان ماچن کی ڈبیوں میں جو خالی ادھ
کھلی سامنے بچھی اسی طریقہ پر پڑتی رہتیں۔ مولوی دیا سلا قی، یہ ڈبیاں کیسی ہیں۔ باوجود یہ بستیاں ہیں
مولوی دیا سلا قی! ان میں تیلیاں تو ہیں ہی نہیں، سب خالی ہیں۔ باوجود بستیاں خالی ہو گئیں۔

بڑ بڑا یا کماں کماں سے لوگ آتے تھے جیسے ہنگیں کٹ کر کیا تی ہیں اور کسی چھت
پر گہر پڑتی ہیں۔“ چپ ہو اور عرفان کو سکنے لگا ” یا ر عرفان اے
” ہوں۔“

” بہت دن ہو گئے ہمیں آتے ہوتے“

عرفان نے اسے گھوڑے کے دیکھا ” چھڑا“

” پھر کچھ بھی نہیں۔“ رکا۔ یولا در تم نے اس سفید سرفالے آدمی کی بات کو ہنسی۔ میں
اڑا دیا سیں اندر سے ہل گیا جسے سارا یکھلا زمانہ زیادا لیا۔ بارا، رک کر بولا ” اب تو تیرے
میرے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔“ اور اس کی نظریں عرفان کی سفید کنپٹی پر ہم گیت۔

” مگر ہمارے بال بھرت میں نہیں، پاکستان کی دھوپ میں سفید ہوتے ہیں۔“

” پاکستان کی دھوپ اے“ وہ پھر حسیے خیالوں میں ٹوپ گیا ہو ” بارا، ہم اس شہر کی دھوپ
میں کتنا چلے ہیں۔ گرمی کی دو پھروں میں پتی مال ہوا کہ تی ہفتی اور ہمارے قدم ہوتے تھے ہماری

آخری منزل پل کے پار والا پہلی کا پیڑ ہو اکرنا تھا، لتنا گھنا تھا وہ پیڑ اور کتنی ٹھستی ہوا کرتی تھی اس کی چھاؤں۔ اب تو وہ پیڑ ہے، ہی نہیں۔ سالوں نے کاٹ ڈالا۔“

عرفان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لگر اس پر اثر ہونا شروع ہو گیا تھا جیسے دبھی پچھلے دنوں میں سفر کرنے پر مائل ہو۔ «بیار عرفان! میں سوچتا ہوں کہ وہ دن ہم پر سخت صورت میں چھپے گے۔»

«ہاں وہ دن اچھے ہی تھے۔»

«وہ دن بھی اور وہ لوگ بھی،»

«اور اب؟» عرفان نے اسے گھوڑے کے دیکھا۔

«ہاں اور اب۔» آواز انی مری ہوتی کہ جیسے ڈھنے گیا ہو۔

دیر تک چبپ بیٹھے رہے، اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ پھر اس نے عرفان کی طرف دیکھا دیکھتا رہا جیسے کچھ کتنا چاہتا ہو گئے بھیک رہا ہو۔

«بیار عرفان!»

عرفان نے اس کی طرف دیکھا، مگر وہ چبپ تھا۔

«کیا بات ہے۔»

«بیار!» رکاما پھر کچھ بھکلتے ہوئے «بیار پاکستان ٹھیک بنا تھا؟»

عرفان نے اسے تین نظروں سے دیکھا «تم پر بھی سلامت کا اثر ہو گیا ہے؟»

«سلامت کا نہیں، یہ تمہارا الشہر ہے۔»

«لیکے؟»

«شک کی جب ابتداء ہو جائے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔»

عرفان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی فدر برہمنی سے اسے دیکھا اور

چبپ سادھی، وہ بھی چبپ بیٹھا رہا۔

”میں لبیں ایک بات جانتا ہوں۔“ آخِر عرفان بولا۔ غلط لوگوں کے ہاتھوں میں آکر
صحیح بات بھی غلط ہو جاتی ہے۔“ اور فراہمی اُنھی کھڑا ہوا۔

”جار ہے ہو؟“

”ٹوبولٹی پر نہیں جانا ہے؟“ اور فراہمی نکل گیا۔

شیراز میں اس وقت بہت سکون تھا۔ اکثر میزین میں غالی تھیں۔ جومیزین بھری تھیں۔
ان پر بھی زیادہ شور نہیں تھا۔ اس لئے سوچا کہ ابھی تھوڑی دیر یہاں اطمینان سے بلیخا جاسکتا
ہے۔ مستقبل میں کوئی خطرہ نظر نہیں آئے تھا، سلامت کی بلا آگزگز رچکی تھی۔

بنجرنے کا وتر پر بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ وہ اکیلا ہے وہ اُنھی کہ اس کے پاس آگیا۔

ڈاکٹر صاحب کیا خیال ہے جنگ ہو گی؟“ اس سے ایسے پوچھا جیسے یہ رائیکی بات

صرف اسے معلوم ہے۔

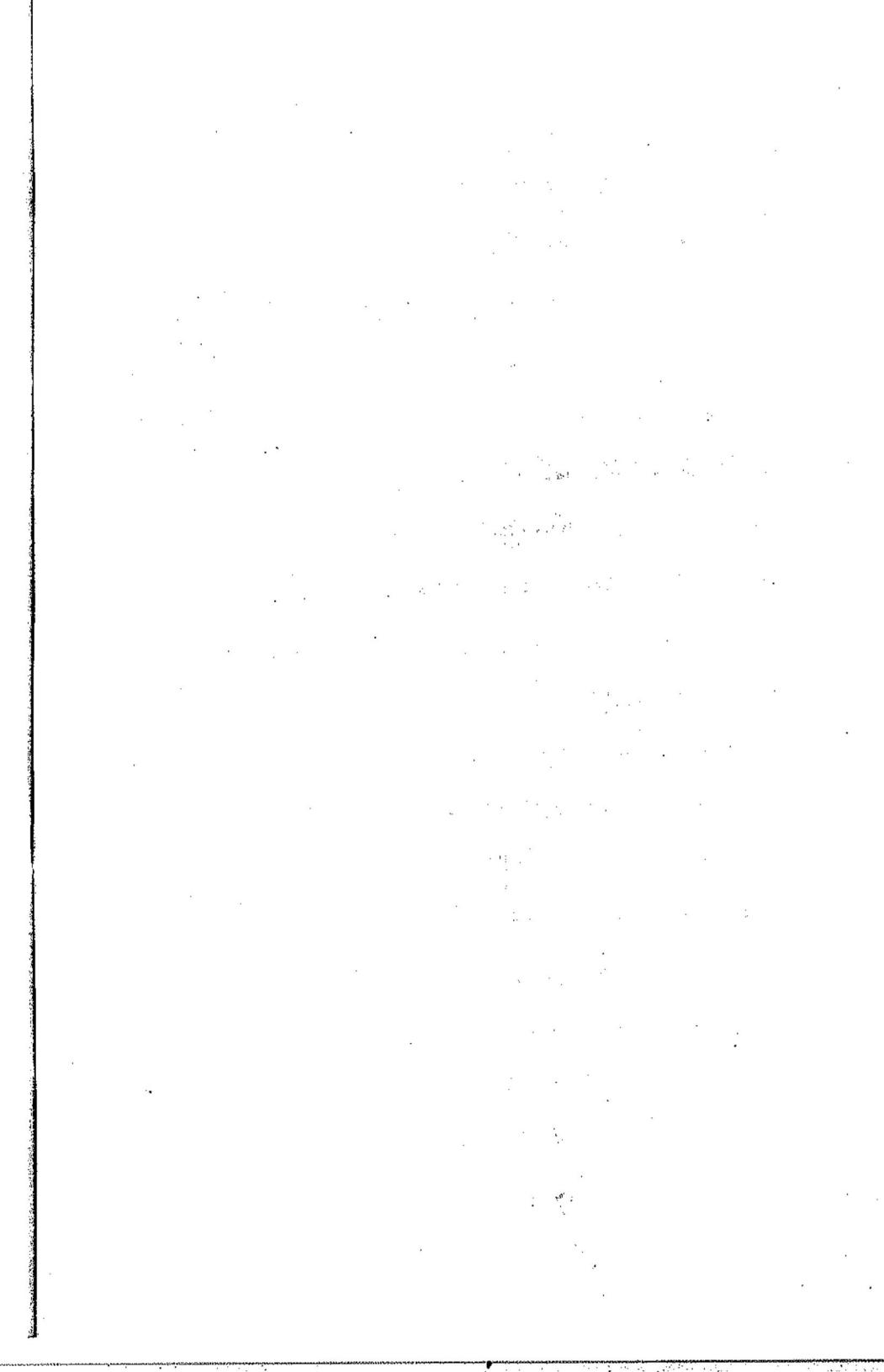
وہ کوڑی طالگی کیا جاوے دے۔ پتہ نہیں کیا ہوتے والا ہے؟“

”میک کہا اسی کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ کیا، موتے والا ہے میں جس سے پوچھتا ہوں وہ
یہی جواب دیتا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے کگر فوجوں کی مومنت اس وقت بہت ہے۔“
اس نے بے دل سے ہوں ہاں کی اور اتنا کہ اُنھی کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر قدسے اطمینان
کا سالن لیا۔

پھر وہی دیواریں، دیواروں پر کئے ہوئے بڑے بڑے اشتہار۔ اس کی نظریں غیر ادی
طور پر پھر ان اشتہاروں کے پیچے چلک رہی تھیں۔ اب شام کے ساتھی چھلٹے جا رہے تھے
اور اشتہاروں کے لفظ اتنے روشن نہیں رہے تھے۔ مگر اس کی نظریں دیواروں کے اشتہاروں
سے گزر کر کچھ بڑھتے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ تو اشتہار میں، نوشۂ دیوار کیا ہے؟
بہوں بھی تو اکثر ہوا ہے کہ دیواروں پر کچھ کھلائیا، نوشۂ دیوار کچھ فکلا۔ مگر دیوار میں اشتہاروں سے
بہی بڑی ہیں۔ نوشۂ دیوار سے یہ خڑا اشتہاروں اور نعروں کے سحر میں چلتے ہوئے لوگ۔

جیسے غلطت میں ہیں اور چل رہے ہیں، چل رہے ہیں؟ کون؟ برایم سے گزرتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر وہ ٹھنڈا گیا۔ کبی شخص آگئے پیچھے اس کے برایم سے گزرتے ہوئے صورتیں صاف تو نظر نہیں آئیں کہ شام کا دھندر کا تھا اور روشنی کا تھیا اس سے کسی قدر دور تھا یہ روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ہے کہ دھندر کے میں صورتیں بالعموم عجیب سی نظر آتی ہیں باواقعی ان کی صورتیں ایسی ہی ہیں۔ ایک شخص پھر برایم سے گزرا۔ مگر اس مرتبہ یا فواس کی نظر وہ کوتا ہی کی یا وہ تیزی سے گزر لیا ہر حال وہ اس شخص کی صورت نہیں دیکھ سکا پھر وہ اس انتظار میں رہا کہ ابکے بُوچھ برایم سے گزرنے کا سہ وہ خوش سے اس کل چڑھ کر کا گزر کوئی برایم سے نہیں گزرا اچ لگستاخ کم وہ جیلن ہوا شام تو بال پرست پُر جو حوم ہوتی ہے۔ آج کیا ہوابا اور جب وہ یہ سورج رہا تھا تو اچانک دو چمکتی ہوئی لکھوں سے اس کی آنکھیں لڑکیں بیالی۔ فٹ پاٹھ سے منصل درخون کے بیچ بیٹھی ہوئی میں اسے جیسے گھور رہی تھی۔ وہ برایم سے گزرا مگر وہ نہیں بیالی جیسے جھی بیٹھی ہو ساکت وجہ بیالی۔ اس کی پتکاری جیسی آنکھیں جو اس سے گھور رہی تھیں۔ برایم سے ایک شخص گزرا چلا گیا۔ وہ اس شخص کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ اس سے چلتے ہوئے دیکھ رہا تھا یہ شخص چل کیسے رہا ہے؟ وہ اتنا بی پُر پایا تھا کہ وہ برایم کی سڑک پر مڑا اور نظر وہ سے اوچھل ہو گیا۔ وہ شخص آغڑل کیسے رہا تھا۔ اس طرح برایم سے گزرا کہ اس کے قدموں کی آہٹی ہی سنائی نہیں دی۔ لوگ آج کیسے چل رہے ہیں؟ وہ سامنے سے آتے ہوئے ایک شخص کے آٹھتھے پڑتے قدم دیکھ کر جیلن ہوا۔ اب اس کی نظر میں لوگوں کے چہروں پر تھیں، قدموں پر تھیں۔ اس پاس چلتے ہوئے مختلف لوگوں کی ٹانگوں کو، ان کے آٹھتھے ہوتے قدموں کو عورتے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم عورت نہیں کرتے ورنہ آدمی اپنی دو ٹانگوں پر چلتا ہوا کتنا عجیب لگتا ہے یا شاید آج لگ رہا ہے آدمی اپنی چال سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر کادی، ہر مخلوق۔ لگھی یہ تو ایسے چل رہے ہیں جیسے اپنی پہچان کھو چکے ہوں۔ اور میں؟ کہیں میں بھی تو ایسے ہی نہیں چل رہا ہوں۔ نہیں، اس نے فعلی انداز میں دل میں کہا اور پھر فوراً اپنی چال کا جائزہ لینے لگا میں ایسے تو

نہیں چلا کر تباہ۔ وہ بڑا بڑا، پھر اس نے اپنی چال دوست کرنے کی کوشش کی تقدیموں کو احتیاط سے اٹھایا، احتیاط سے رکھا گکھ جیسے اس کی چال بگھتی چلی جاتی ہی ہو۔ اج میری چال کو کیا ہو گی ہے؟ تماں کیا، پھر سوچا کہ اج سے پہلے کبھی میں نے اپنی چال پر عذر بھی تو نہیں کیا تھا۔ ہم چلتے رہتے ہیں اور کبھی غور نہیں کرتے کہ کیسے چل رہے ہیں۔ یہ میں چل رہا ہوں۔ وہ ایک دم سے ٹھیک گیا۔ اپنی عین انسانی سی چال کو دیکھ کر اسے عجیب ساختاں آیا کہ وہ نہیں، اس کی جگہ کوئی اور چل رہا ہے۔ مگر کون؟ وہ شخص میں پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے شک پر قابو پایا۔ ناپ توں کو قدم اٹھاتے تقدیموں کی چاپ کو سنا۔ نہیں، میں ہیں، میں یہاں اپنے شہر کے اس پہنچ فٹ پاھنچ پر، اور یہ میرے تقدیموں کی چاپ ہے۔ مگر جب وہ اس طرح اپنے آپ کو اٹھینا ان دلار میں تھا تو اسے وہ ساپووا کہ اس کے قدموں کی چاپ اس کے قدموں سے دور ہوتی جاتی ہے۔ عجیب بات ہے یہ میں یہاں پل رہا ہوں اور میرے قدموں کی چاپ وہاں سے آ رہی ہے۔ کہاں سے؟ پل رہا ہوں؟ کس پاشاپید میں یہاں ہوں اور پل کہیں اور رہا ہوں۔ کہاں؟ میں کہاں چل رہا ہوں؟ کس زمین پر قدم پڑ رہے ہیں؟ اس نے جیلن ہو کر کامڈگر و نظر والی سب سنسان، ویران جیسے بستی خالی ہو گئی ہو، جیسے دیا سلالی کی ڈبیا خالی ہو جاتی ہے۔ مکان و سر اور جا سب خالی کوئی آہنگ کوئی آواز نہیں قدم کی چاپ، کچھ نہیں، بس چاروں طرف سے آئی ہوئی کترنے کی آواز، جیسے بہت سے چوچے کچک تر رہے ہوں۔ دیشت زدہ، حیرت گر فتہ ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں، دوسرے کوچے سے تیسرا کوچے میں۔ ایک کوچے میں چلتے چلتے اس نے اگے رستہ پنڈ پایا۔ ایک کیا جائے؟ جو یہ کا پھاٹک پنڈ تھا۔ اس نے بند پھاٹک پر دشک دی چکوئی ہے؟ پکار پوری سستی میں گوئی بگئی کوئی ہے، کوئی ہے۔ جیسے وہ ازل سے اس بند پھاٹک پر کھڑا ہوا در پکار رہا ہو گئی کوئی ہے؟ اپنے دوپریوں پر کھڑی ایک بیٹی نے دروازہ کھولا، اسے ٹکر کے دیکھا اور دروازہ بند کر لیا۔ تیسرا سرخ ہو گئی۔ وہ نیزرا کمر استگ کو عبور کرنے کا تھا لہ رک گیا۔ رک کی ہوتی موڑیں، رکشائیں اور سکوڑا جیسے اچانک سامنے سے گزرے جیسے دیا کا بندلوٹ گیا ہو۔



یار ذاکر!

پھر تم میر اسمی سلام نوادر جان لو کہ میں خیر سیت سے ہوں اور تمہاری خبر و حافظت نیک
مطلوب ہے۔

تم چراں ہو کے سوچ رہے ہو گئے کہ گھنٹت کو خط لکھنے کی کس وقت سوچی ہے اور خیرت
بیجھتے اور معلوم کرنے کا کس مالمیں بخیال آیا ہے میں بھی بھی سوچ رہا ہوں کہ لئے برس سے
نہیں نے خط لکھا اور تم نے یاد کیا اور ایسا غیر وقت میں یہ کایا کہ تم باداً گئے ہو، اور میں خط لکھ
رہا ہوں مجھے ڈاک کے دوام وہرہم سلسلے کو دیکھتے ہو تو یہ بھی اعتبار نہیں کیا خدا تمہیں ملے گا۔
پھر پھر بھی لکھ رہا ہوں آخر کیوں؟ ابھی بتانا ہوں۔ پھر یہ سن لو کہ میں نے ٹکڑا کیک مرتبہ پھر
تبدیل کر لیا ہے۔ اب ریلیوں میں آگیا ہوں۔ ایک فائدہ تو ہماں اُنے سے ہوا کہ فالتوں کے
پوکارو پار سے اپنی خاصی بخشات مل گئی ہے۔ ہماں معاملہ لوگوں سے ہے، فالوں سے تین
فالوں کے مقابلے میں یہ مشکل کام ہے گہر کام نہیں۔

یا اب ہماں اگر ایک عجیب لڑکی کو دیکھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھی اُس
سے مل پھر طہوگی۔ گہواں زنگ، پتلے پتلے نقش، پھر سریاں، درمیانہ قد، طور طریقے پیدا ہے پچھے،
ہمیشہ سفید سوتی ساطھی میں نظر آتی ہے۔ بسی بھی انگ نکال کر چوٹیا باندھتی ہے، پھر بھی ایک لٹ
کبھی کبھی اس سے منہ پر پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ لئے دیتے رہتی ہے۔ چپ چپ، اُداس اُداس۔

یار اس کی سادگی اور اداسی نے مل کر مجھے لوٹ لیا۔ میرے اس فقرے پر ٹھکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے پوری بات سن لو۔

میچے وقتاً فوڈیا یوز روم میں بھی جانا پڑتا ہے میری اس کی ٹاپھیڑوں میں ہوتی۔ اس سے پہلے میں نے آتے جاتے اسے دیکھا تھا۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ وہ یہاں ناگزیر ہے۔ اس کا نام بھی کان میں پروٹا ہوا تھا۔ لگبھر بھی اس کے پارے میں میں ابسا بخس نہیں ہوا۔ سادگی شروع میں آدمی سے کچھ نہیں کھتی اور اداسی دھیرے دھیرے سحرتی ہے وہ چپ چاپ آتی، ڈھاکہ کے مغلق خبریں معلوم کرتی اور جلی جاتی۔ خیروں تشویش کہ ہر ٹین مگر کیا مجال کہ اس کے چہرے سے کسی پر لیٹاتی کا انہما ہو جاتے۔ یہ میں تے اپنے قیافے سے جانا کہ یہ لڑکی ان خیروں پر اندر سے بہت پر لیٹاں ہے میں نے اس سے ایک روز پوچھ لیا کہ ”بی بی! اڑھاکہ میں آپ کے کوئی عزیز نہیں؟“

”جی ہاں، وہاں میری والدہ اور ہمسیر ہیں۔“

”خط و طآر ہے ہیں؟“

”آخری خط دو ہفتے پہلے آیا تھا۔ اس کے بعد سے میں دو خط بھیچکی ہوں۔ بتا رجھی دیا کوئی جواب نہیں آیا۔“

”لگبھر یہ پر آتے والی خیروں سے آپ کہ کیا پتھر چلے گا؟“

”کم از کم شر کی حالت کا اندازہ تو ہو سکے گا۔“

”تو پھر میرے کمرے میں آئیں۔ میری میز پر ڈھاکہ کے سارے اخبار ہوتے ہیں۔“ اس کے بعد سے اس نے میرے کمرے میں آنحضرت کر دیا۔ پابندی سے روز آتی ڈھاکہ کے سارے اخباروں کا مطالعہ کرتی اور جلی جاتی۔

”آپ کے ہاتھی عزیز نہیں ہیں؟“، ایک روز میں نے پوچھا۔

”کوئی کہاچی میں ہے، کوئی لاہور میں کوئی اسلام کیا دیا ہے۔“

« اور یہاں؟ »

« یہاں تو اب کوئی نہیں ہے۔ »

« یہاں صرف آپ ہیں؟ »

« جی، میں ہندوستان میں اکیلی ہوں، »

بھرے ہندوستان میں اکیلی رہ جانے والی ایک سلمان لڑکی، مجھے یہ بات عجیب سی لگی مجھے یہ پتہ ہے کہ یہاں سیپورے پورے خاندانوں نے بھرت کی ہے اور تیچھے کوئی ایک فرد رہ گیا ہے مگر یہ فرد بالعموم بوڑھا آدمی پایا گیا ہے۔ اکیلے رہ جانے والے ان بوڑھوں کو جاندے اداکے خیال نے نہیں روکا ہے، قرکے خیال نے روکا ہے۔ جاندار کا کیا ہے، اس کا تو پاکستان میں جاکر کیم داخل کیا جا سکتا ہے اور جعلی کیم داخل کر کے ہر چھوٹی جاندار کے بدھے میں بڑی جاندار ٹھیک کی جاسکتی ہے۔ مگر قبر کا کوئی کیم داخل نہیں کیا جاسکتا۔ ویاس پور میں وہ جو کوٹلہ والے حکم جی تھے نہ، ان کا پورا خاندان پاکستان چلا گیا وہ اپنے ٹھیک پہ بیٹھے رہے اور یہاں روں کی بھیں دیکھتے رہے۔ میں نے پوچھا:

« حکم جی! آپ پاکستان نہیں گئے؟ »

« نہیں لا الہ - »

« کارن ۹۹ »

« لا الہ اکارن معلوم کرتے ہو؟ تم نے ہمارا قبرستان دیکھا رہے ہے؟ »

« نہیں - »

« ذرا بھی جا کے دیکھو۔ ایک سے ایک گھنٹا پڑتے ہے۔ پاکستان میں میری تبر کو ایسی چھاؤں کاہاں ملے گی؟ »

میں دل میں ہنسا۔ یار تم سلمان لوگ خوب ہو۔ بیوں عرب کے صحراؤں کی طرف دیکھتے ہو گہرے قبروں کے لئے نہیں ہندوستان کی چھاؤں بھاتی ہے۔ یہاں تیچھے رہ جانے والے

بڑھوں کو دیکھ کر میں نے یہ جانا کہ مسلمانوں کی تہذیب میں قدرتی بڑی طاقت ہے۔ لگدی کہ اس لڑکی کو بھی قبر کے خیال نے بازہ رکھا ہے؟ اس خیال نے مجھے چکرا دیا۔ ایک روز میں نے اُس سے بچھ لیا:

«آپ کا بولا پہلوار پاکستان میں جا چکا ہے۔ آپ ہیں کیتن؟»

«جی میں نہیں گئی۔»

«کارن؟»

«کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر بات کا کوئی کارن بھی ہو۔»

«کوئی ضروری تو نہیں، پھر بھی ہی؟»

پھر پہ کہ میں پاکستان چلی بھی جاتی تو کیا فرق پڑتا۔ میں پاکستان میں بھی اکیل ہوتی۔ میں اس کی صورت تکھنے لگا۔

«آپ رہتے والی کس نگہ کی ہیں؟»

«روپ نگہ کی۔»

«روپ نگہ! میں چونک پڑا۔ درا رے آپ وہ صاحب ہیں؟ وہ میرے اس در عمل پر کچھ چکرا گئی۔ مگر میں نے اسے زیادہ دیر چکر میں نہیں رکھا۔ جلدی سے پوچھا:

«آپ ذاکر کو جانتی ہیں؟»

اس نے جواب میں مجھے سر سے پیڑک خود سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی:

«اچھا لو آپ وہ سر نیڈر صاحب ہیں۔»

اس کے بعد وہ بالکل چپ ہو گئی۔ میں بھی سٹھانا کم چپ ہو گیا۔ پھر وہ جل گئی۔ وہ میرے دن وہ نہیں آئی۔ تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ مگر میرے لئے اب اس لڑکی میں نے معنی پیدا ہوا۔ گئے تھے۔ اب میرے لئے وہ ریلی یوکی انداز نسلی طکی نہیں تھی، مگر شدہ دوست کی نشانی تھی۔

میں نے اسے جا پکڑا اور اس نے نکلفت ہو گیا۔ صابر وہ تم مجھ سے ناراض ہو؟»

”کس بات پرس؟“

”بات جو بھی ہو، ہر حال آدمی کو دوسرا سے کی جذباتی زندگی کے علاقے میں دیکھ بھال کرے۔

قدم رکھنا چاہیئے۔“

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا مگر دوسرا دن وہ آتی اور ڈھاکہ سے آتے ہوئے اگلے پچھلے سارے اخبارات کا انہماں سے مطلع کیا اور ترب سے اس کا یہ معمول بن گیا ہے کہ وہ مقرہ اوقات میں آتی ہے، ڈھاکہ کے اخبارات کی ملٹی پلٹی ہے، مخصوصی گفتلوں کہتی ہے۔ پہنچنے یقینی ہے اور چلی جاتی ہے نہیں نے ایک دو مرتبہ نہ مارا ذکر کیا مگر ہر مرتبہ ہی ہو اکرنا تو اس نے چھپ سادھی یا کوئی اور ذکر چھپیر دیا۔ سو میں اب احتیاط پر تباہوں اور عتمارا ذکر نہیں کیتا۔ لگر بجھے معلوم ہے کہ ہم جب ملتے ہیں تو وہ نہیں ہوتے تیرسا آدمی فاسد ہو کر وہاں موجود ہوتا ہے۔ شاید اب وہ اسی تیسرے آدمی کی خاطر مجھ سے ملتی ہے۔ ڈھاکہ کے اخبارات اب صحتی چیزیں۔ ایک روز میں نے پوچھا:

”صایبرہ انہمارا شنا دی وادی کا کوئی پروگرام ہے؟“

”دیکھنی نہیں۔“

”کارن؟“

”وہ مٹکی، پھر چیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔“

”دیکھئے آپ نے پھر غلط علاقے میں قدم رکھ دیا ہے۔“

”SORRY“ میں نے مادرت کی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اُسی چیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا اور چپ ہو گئی۔

پرانے اکابر ایسے انہماری صایبرہ بھی تولٹکی سے زیادہ تاریخ کا ایک عجیب نظر آتی ہے۔ پاریسا مت ماننا، تم لوگوں کی تاریخ ہندوستان میں عجیب ادبی کھاڑی چلی ہے۔ پہلے انہمار فائیجن آتے اور اس زور شور سے آتے کہ ان کے گھوڑوں کی ٹالپوں سے یہاں کی نہیں بلکہ

اوڑلواں کی بھنکار سے فضا گوئخ اھٹی۔ پھر سپاہی رہنا مودار ہوتے اور انہوں نے اپنی گھن
گھج دکھائی۔ باہر، اکبر شاہ بھمان، اول تگ نیب۔ پھر سید احمد خاں، مولانا محمد عسلی،
محمد علی جناح اور ان سب کے بعد تمہاری صایرو۔ یہرے ہندوستان میں اکیلی رہ جانے والی
اکب اداں خاموش ملٹکی۔ پتہ تھیں یہ تمہاری تاریخ کاملاں ہے یا تمہیں بول کی تاریخ، یہی اس طور
چلتی ہے۔ شمشیر و سنان اول۔ اور آخر، تمہارے جیکم الامت کی نظر اس آخر پر یعنی یا
نہیں تھی تقدیر امام کا ایک رنگ، یہ بھی ہے۔ ہاں وہ عین کادن تھاںیں تے دیکھا کصاید و سلوکیو
سے تکل رہی ہے میں اس روز اسے دیکھ کر تھوڑا سیران ہوا۔ اسے تم؟ تم تے آج چھٹی
نہیں کی؟“

”بھی تھیں۔“ خفتر جواب آیا۔

” تو پھر ہیں عید منا اور ہماری خاطر کرو۔“

”ضرور، چلتے ہمارے کرے میں۔“

اپنے کرے میں جاکر اس نے چاتے کا ارٹر دیا، ایک مرٹکا بیا۔ وہ چلتے ہماری تھی اور
میں سوچ رہا تھا کہ عید کے دن کو ان مسلمان دفتر میں ڈبوٹی دیتا شہے۔ بلکہ دفتری بالپر تو ان
دنوں شریں نہیں تھکتے۔ ایک دن پھر ہی، وقت سے پہلے دفتر سے شک جاتے ہیں اور لڑک
کٹا کہ سیدھے اپنی بستی پہنچتے ہیں اور لٹکیاں؛ لٹکپاں تو مردوں سے یڑھ کر عید منا تی ہیں۔ میں
تے چاتے پہنچتے پہنچتے پوچھ لیا:

” صابرہ! تم روپ نگہ نہیں گئیں؟“

” روپ نگہ؟“ اس نے تعجب سے بھیج دیکھا۔ ”وہ کس لئے؟“

” آپ لوگوں کے یہاں رواج بھئے کہ لوگ عید پر پوسیں میں نہیں تھکتے، لھر جا کر عید
مناتے ہیں۔“

” میں شاید آپ کو اپنی خالدانی صورت حال بتا جائی ہوں۔ روپ نگہ میں ایسے ہمارا کوئی

نہیں ہے۔»

میں چپ ہو گیا۔ پھر یوں تھی پلاٹھے پلیتے پوچھ دیا:

”کیا دور کے عزیزوں میں بھی وہاں کوئی نہیں ہے؟“

”دور کے عزیزوں سب چالکے ہیں۔ روپ نگہداری ہو چکا ہے۔“

”لکھتی عجیب بات ہے،“ میں پڑا بڑا یا۔

”آپ چاتے اور بیخ ہے گا؟“ اس نے میری بات کاٹی اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

میری پیاری میں چاتے بنا کی شروع کر دی۔ مگر میں نے چاتے پلیتے پلیتے پھر ایک سوال جڑ دیا۔

”تم دلی کامہ کیا پھر کبھی روپ نگہ نہیں کیتیں؟“

”نہیں۔“

”عجیب بات ہے لکھتے دن ہو گئے اس بات کو؟“

”اب تو اس بات کو زندگی پر چکا 1971 کے شروع میں دو ماہی ہائی کاؤنٹر ہاکہ سے خط آیا تھا کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے، آپ لوگ آ جائیں۔ انہی دنوں مجھے آل انڈیا مریڈیلوس تقری کا پردہ وانہ ملا تھا۔ میں نے دلی کا رخ کیا۔ باجی اور اسی تے ڈھاکہ کی راہ میں۔ روپ نگہ کی طرف سے پاکستان کو بھیجی جانے والی یہ آخری قسط عتی۔“

”اور تم نے ہندوستان میں لکھنے کا فصلہ کیا؟“

”یہ تھا کی صورت باقی رکھی تھی؟“

اس جواب پر مجھے چپ ہو جانا چاہیے تھا مگر میں نے اس کے شاستر طنز یہ لمحے کو نظر انداز کیا اور کہا:

”میر مطلب یہ ہے کہ اگر یہ پاکستان چلی گئی ہر دین تو۔“

میں خود اس کا اور اس نے تیر لیجے میں فوراً میری بات کاٹی۔ تو؟ تو کیا ہوتا؟ اور اس نے مجھے ایسے دیکھا کہ مجھے پنی بات پوری کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ تم مجھ سکتے ہو کہ

میں کیا کہتا چاہتا تھا؟

یار لکنی عجیب بات ہے کہ وہی ایک بستی اپنے ایک بائی کے لئے کہ بحیرت کہ لگایا ہے پھر سے
بڑا ٹھکرایا معنی ہو گئی کہ وہ اسے خوابوں میں دیکھتا ہے اور دوسروں کے لئے اس کے سارے معنی
جا تے رہے کہ وہ اسی دلیں میں ہے لگر کبھی اس کے یہاں اس بستی کو دوبارہ دیکھنے کی آزو پیدا نہیں
ہوتی، بحیرت نے روپ نگر کو کہتا یا معنی بنا دیا ہے اور صابرہ کو ہندوستان میں ٹانکے رہنے کی لکتی
سزا ملی ہے کہ روپ نگر اس کے لئے معنی ہو گیا ہے میں سوچتا ہوں کہ میری تقدیر بھی وہی ہے
جو صابرہ کی ہے اور زیبی بھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید بالذین میں میں نے کسی رشی منی کا اچان کیا تھا
اور اس نے مجھے سراپ دیا تھا کہ پتیری جنم بھوئی تھے درشن رینا بند کر دے گی۔ سو دیاس پور کی
بلگہی اب مجھے درشن نہیں دیتی۔ میں جب بھی وہاں جاتا ہوں مجھے لگتا ہے کہ نگری پوچھ رہی ہے کہ
دوسرے کہاں ہے اور جب مجھ سے جواب دین نہیں پڑتا تو وہ مجھ پر اپنے دوار بند کر لیتی ہے وہ جو ایک
چاہت ہو اکمرتی تھی کہ کوئی چھٹی آئے اور دوڑ کرو یا سوپر ہچھ جائیں وہ چاہت ایس بالکل نہ
چکی ہے۔ بہت دونوں کے بعد میں پچھلے اس اڑاکہ میں وہاں گیا تھا۔ یہ اس اڑاکہ کے شروع کے دن تھے
برسات ابھی دور تھی اور دوپہر میں اپنے عروج پر تھیں۔ ایک کھڑی دوپہر میں میری آوارگی کی
سوئی ہوئی رگ پھٹک کی اور میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے میری
گلی میں۔ بارہ گلی نے مجھ سے یہی پوچھا کہ دوسرے کہاں ہے؟ میں محسوس کر رہا تھا کہ ایس ان گلیوں
سے میرا کوئی ناتا نہیں رہا، جیسے سب گلیاں مجھ سے خفا ہیں۔ رم جنم والی گلی سے بھی گزرا۔
وہ ٹیوڑھی تو بہت ہی فیران نظر آئی۔ رم جنم کی ماں اپنے ادھ کھلنے پڑنے اور ڈھلنے جو بنی
کے ساتھ ٹیوڑھی میں اکیلی ٹھیک چرخا کات درہی تھی۔ میں ان گلیوں سے نکلا اور اپنے سکول
کی راہ پر پڑا کیا۔ چھٹیوں کے دن تھے، سکول پندرہ پر اتھا۔ خالی پرکاروں سے گزر کر فیلڈ کی
طرف چلا۔ یہاں ایک میری نظر پر اٹھنا کے استھان والے آم کے پیڑ پر پڑی۔ میں اس کی چھاؤں
میں جا پھیلا۔ یا راس کی چھاؤں میں کتنی کتنی دیسی بیٹھے رہا کہرتے تھے اور انہیں مار مار کر اہمیاں گردیا

کرتے تھے۔ اس سمجھی شاخیں امیوں سے لدی ہوتی تھیں۔ میرا بے ساختہ جی چاہا کہ اینٹ
ماں کہ امیاں گراوں مگر پارا ہاتھ جیسے سن ہو گیا ہو۔ اینٹ مارتے کے نئے اٹھا، ہی نہیں میں جب
بیٹھا رہا اور امیوں سے لدی ہری شاخوں کو دیکھتا رہا۔ ٹپ سے ایک امیا میرے سامنے^{تستی}
اکے گئی۔ یہ کیا؟ اس سمجھے تو ہوا بھی نہیں چل رہی ہے اور طوپوں کی کوئی ٹار بھی پیڑ پر
ہوتی نہیں ہے۔ کیا اپنے آم کے پیڑ نے مجھے پہچان لیا ہے! اس من اداس ہو گیا اور اٹھ کھڑا ہوا
گلیاں چڑھا یا اور پیڑ نہ پہچانیں تو دکھ ہوتا ہے، پہچان لیں تو طبیعت اداس ہوتی ہے۔
تو نیم کے پیڑ کو تلاش کرتا پھرتا ہے (کوئی نیم کا پیڑ ملا؟) یہاں صورت یہ ہے کہ نیم، امی، آم،
پیپل سب اپنے اپنے استھان پر موجود ہیں۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر انجانے بن جاتے ہیں۔ ایک برس کش
نے مجھے پہچانا تو اس تو پیاس ہو گیا۔

پیارے! اپنے نئے تواب اداسی ہی اداسی ہے۔ تو نے والی چاکے کچھ کمایا ہو گا۔ میں نے
تو یہاں رہ کر کچھ نہیں کمایا، میں عمر ہی گناہی ہے۔ یا مری کنپیاں بالکل سقید ہو چکی ہیں۔
تیری کنپیوں کا کیا حال ہے۔ اور ایک بات اور بتاؤں اور سب سے زیادہ اداس کر دینے والی
بات یہی ہے۔ کل جب میں صابرہ کے ساتھ چاٹتے ہی رہا تھا تو میری نظر اس کی ماں پر جا پڑی
کس سلیقے سے سیدھی ماں کی نکاتی ہے! میں نے دیکھا کہ کالے بالوں کے بیچ ایک بال چاندی کی طرح
چمک رہا ہے۔ تو اسے مرے منزہ! سب سے بیت رہا ہے۔ ہم سب سے کی زد میں ہیں۔ تو اس بدلی
کو اور آ جا۔ اکر شہر دلی کو دیکھا اور شہر خوبی سے مل کر دونوں تیرے انتظار میں ہیں۔ آور اس
سے پہلے کہ اس کی ماں میں چاندی پھر چلتے اور اس سے پہلے کہ تیرا سر پر فتنہ کا گالا بن جائے
اور ہم کہانی بن جائیں۔ فقط
سر نیڈ

« اور اس سے پہلے کہ، » — وہ بڑھتا ایسا، خط کو جہاں تھاں سے پھر پڑھا اور
سوچ میں ڈوب گیا۔

در ہندوستان تک سے خط آ رہے ہیں۔ میں ایک اٹھا کر ہی کو کچھ ہو گیا ہے کہ وہاں سے
کوئی خط نہیں آتا۔“ اسی نے افسر د الجھے میں کہا اور چپ ہو گیئیں۔ پھر سوچ کر بولیں ہندوستان
سے کس کا خط آیا ہے۔“
”سریندرا کا۔“